اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں اردو آپ بیتیوں پر محررہ مقالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

[1] رحمان سرور باجوہ

Abstract:

Autobiography is an important stakeholder in the field of literature. It poccess the history, politics, religion, society and psychology in its context. So due to the specific importance the Department of Urdu has made research at all stages. So, keeping in view the importance of autobiographical research, it is necessary that not only should there be a list of researched thesis in universities, but also an overview of the research done on these thesis in order to provide guidance to the new researcher in the field of research. In this article, research has been done on the autobiography thesis written in Urdu at the level of M.A and M.Phil in the Department of Urdu of Islamia University, Bahawalpur. So that an improvement in the field of Autobiography research can be taken place.

Keywords: **Autobiography, Institutional Research, Specific Research, Qualitative Research, M.A, M.Phil, Thesis, Bahawalpur, Urdu, Overview.**

جامعات میں تحقیق شدہ مقالات کی نہ صرف فہرست مرتب ہونی چاہیے بلکہ ان مقالات پر ہونی والی تحقیق کا اجمالی جائزہ بھی مدون ہونا چاہیے تاکہ تحقیق کے میدان میں نووارد محقق کے لیے راہنمائی کا ساماں میسر آ سکے۔ مقالہ میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ اردو میں ایم اے اور ایم فل کی سطح پر اردو آپ بیتی کے تحریر شدہ مقالات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ آپ بیتی کے فن اور روایت میں مزید بہتری لائی جا سکے۔

کلیدی الفاظ: آپ بیتی، سوانح حیات، سوانح نگاری، جامعات، سندی تحقیق، کیفیتی تحقیق، مقالات، تنقید، ایم اے، ایم فل، بہاول پور، اردو، اجمالی جائزہ

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں آپ بیتی کی صنف پر اب تک آٹھ مقالات لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے چار مقالات ایم اے کی سطح کے ہیں اور چار مقالات ایم فل کی سطح کے ہیں۔ موجودہ آرٹیکل میں ان آٹھ مقالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

ثمینہ امین نے ۲۰۰۲ء میں ایم اے کی سطح پر ''جو رہی سے خبری رہی (ادا جعفری) اور ہم سفر (حمیدہ اختر) کا تقابلی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔ ثمینہ امین نے اس مقالے میں آپ بیتی کے فن کے تقاضوں پر سیر حاصل بحث کی اور آپ بیتی میں اخفائے ذات و انکشاف ذات کے قضیے کو مختلف ماہرین کی رائے سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ ادا جعفری کی آپ بیتی سے متعلق لکھتی ہیں کہ ''ادا جعفری کی خود نوشت زمانے کے

---

[1] پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

حوالے سے خود کو اور اپنے حوالے سے زمانے کو جاننے کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔''[۱] مقالہ نگار ثمینہ امین نے آپ بیتی کا سیاسی و سماجی حوالے سے مطالعہ کیا ہے اور جہاں سقوط ڈھاکا کے حوالے سے ادا جعفری کے کرب کو آپ بیتی میں نمایاں کیا ہے وہاں مصنفہ کی ترقی پسند تحریک میں عدم شمولیت کے باوجود ان کی تحریر میں اس تحریک کے اثرات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ آپ بیتی کے نفسیاتی مطالعے کی ذیل میں ثمینہ امین لکھتی ہیں کہ ''ادا جعفری کی آپ بیتی کا نام ''جو رہی سو بے خبری رہی'' نہ صرف شاعرانہ ہے بلکہ اس میں انسان کی بے بسی لاچاری اور بے اختیاری کا احساس پنہاں ہے۔''[۲] سماجی حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے ایک جگہ مقالہ نگار لکھتی ہیں:

> ''جو رہی سو بے خبری رہی ایک خاتون کی آپ بیتی ہونے کے ناتے اُن تمام خواتین کی زندگی اور مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے جنھوں نے گھر کی چار دیواری میں مقید ہونے کے باوجود اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔''[۳]

مقالہ نگار ثمینہ امین نے حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''ہم سفر'' کا تجزیہ اس آپ بیتی کے نزول کے اسباب سے کیا ہے کہ حمیدہ اختر نے ڈاکٹر جمیل جالبی اور فہمیدہ ریاض کی حوصلہ افزائی کرنے پر اس آپ بیتی کو لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ثمینہ امین کے نزدیک آپ بیتی ''ہم سفر'' کی حیثیت ایک عجائب خانہ کی ہے جو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ حمیدہ اختر نے ''ہم سفر'' میں اپنے سے زیادہ اختر حسین رائے پوری کے حالات کو بیان کیا ہے لیکن مقالہ نگار کا استدلال کہ آپ بیتی صیغۂ متکلم میں لکھی گئی ہے اور آپ بیتی میں حمیدہ اختر کی اپنی ذات کی موجودگی، اس تصنیف کو آپ بیتی کے فن کے قریب کرتی ہے۔ مقالہ نگار نے دونوں آپ بیتیوں کے اسلوب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ادا جعفری کے اسلوب کو شستہ اور تخلیقی نوعیت کا قرار دیا ہے اور حمیدہ اختر کے اسلوب کو سادہ اور شگفتہ قرار دیا ہے۔

''آپ بیتی کا فن اور میرزا ادیب کی آپ بیتی'' عطیہ رسول کا ایم اے کا مقالہ ہے جو ۲۰۰۴ء میں تکمیل کو پہنچا۔ مقالے کے آغاز میں مقالہ نگار نے اس تحقیق کو اپنی پہلی کاوش بتایا۔ عطیہ رسول کے نزدیک ''آپ بیتی کو اپنی زندگی کی کہانی اپنی زبانی پیش کرنے کا نام ہے۔''[۴] مقالہ نگار عطیہ رسول نے مختلف ماہرین

کے نقطہ نظر سے آپ بیتی کے فن کی وضاحت کی ہے اور ایک اچھی آپ بیتی کے لیے ذات کے احتساب و محاسبہ کو ضروری قرار دیا ہے اور آپ بیتی میں خیر و شر، مثبت و منفی دنوں اقدار کے رنگ کو پیش کرنے پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ناکامیاب آپ بیتی کی وجوہ کی نشان دہی کی ہے: اول اپنے آپ سے محبت اور دوم دوسروں کا خوف۔ مقالہ نگار نے ان دونوں رکاوٹوں کا نفسیاتی و سماجی جائزہ لیا ہے۔ عطیہ رسول ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو آپ بیتی کے فن کے لیے ایک اہم سنگِ میل قرار دیا ہے۔ مقالہ نگار عطیہ رسول نے اپنی تحقیق میں آپ بیتی میں صداقت کے عنصر کو ہی زیر بحث لایا ہے جب کہ آپ بیتی کے فن کے تمام تقاضوں اور محرکات سے پردہ نہیں اُٹھایا۔ میرزا ادیب کی آپ بیتی ''مٹی کا دیا'' کے تجزیے میں عطیہ رسول نے آپ بیتی نگار کے سوانح حالات کا ذکر کرنے کے ساتھ ان کے پوشیدہ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ایسے واقعات کی نشاندہی کی ہے جن سے میرزا ادیب کے ارد گرد کے ماحول کے سماجی و سیاسی اور نفسیاتی و ادبی عناصر بھی اجاگر ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار نے آخر میں آپ بیتی کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالی ہے اور آپ بیتی کے اسلوب کو علامتی و افسانوی قرار دیا ہے۔

''اردو کی خواتین آپ بیتی نگار'' ممتاز پروین کا ایم فل کا مقالہ ہے جو کہ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۰۶ء کے سیشن میں لکھا گیا۔ اس دورانیے میں خواتین آپ بیتی نگاروں کے فن پر بہت کم لکھا گیا تھا اور اس جامعہ میں اس موضوع پر یہ پہلا مقالہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ مقالہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب آپ بیتی کے فن سے متعلق ہے اور باقی ابواب کو ان عنوانات کا نام دیا گیا ہے۔ ''بیتی کہانی''، ''کاغذی ہے پیرہن''، ''ہم سفر''، ''جو رہی سو بے خبری رہی''، ''بُری عورت کی کتھا''، ''بچھڑے لمحے''، ''گئے دنوں کا سراغ'' اور ''میرے حصے کی روشنائی''۔ مقالہ نگار نے اپنی تحقیق کے پہلے باب میں آپ بیتی کے اصول و ضوابط پر روشنی ڈالی ہے اور آپ بیتی و سوانح نگاری کے مابین فرق کو واضح کیا ہے۔ یہاں مقالہ نگار نے آپ بیتی اور یادداشتوں میں پائے جانے والے فرق کو بھی واضح کرنا چاہیے تھا۔ اس امتیاز کو ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے محققہ اپنی تحقیق میں ایک ایسی تصنیف کو بھی شامل کر لیا ہے جو آپ بیتی سے زیادہ یادداشتوں پر مبنی ہے۔ یہ تصنیف ''میرے حصے کی روشنائی'' ہے جو کہ نور سجاد ظہیر کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ جس طرح ایک عمارت کا نقشہ اس عمارت کے خدوخال کو واضح کرنے میں یا اس کو متناسب رکھنے میں اہم ہوتا ہے اسی طرح کسی بھی مقالے کا جو خاکہ ہوتا ہے وہ اس مقالے کی جان

ہوتا ہے۔اب اس مقالے میں جو خاکہ بنایا گیا ہے اس میں کئی ایک سقم نظر آتے ہیں۔ تحقیق میں آٹھ آپ بیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ہر آپ بیتی کو ایک باب کا نام دیا گیا ہے۔ طوالت کے باوجود مقالہ نگار نے بڑی محنت سے کام کیا ہے اور ہر آپ بیتی کا تجزیہ اس کے خواص یعنی نسائی، سماجی، اخلاقی اور ادبی حوالوں سے کیا ہے۔ جیسے عصمت چغتائی اور کشور ناہید کی آپ بیتی میں نسائی پہلو، حمیدہ اختر کی زندگی رومانوی انداز، ادا جعفری کے بچپن کا گھٹن زدہ ماحول، اور شعری سفر کے ہم نشینوں کے احوال، رضیہ بٹ کی سماجی دور اندیشی، نثار عزیز بٹ کے پون صدی کے تجربات و مشاہدات اور نور سجاد کے افکار و خیالات کو ترقی پسند تحریک کے تناظر میں پرکھا ہے، جس میں سجاد ظہیر کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نور سجاد ظہیر لکھتی ہیں:

> ''سجاد ظہیر نے ترقی پسند ادب کی تحریک کو توانائی اور زندگی بخشی اور اس طرح عوام کے ادبی شعور کی ترقی کے امکانات کو محدود سے لامحدود کر دیا۔''[۵]

ممتاز پروین کی تحقیق سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ مقالہ نگار نے کس بنیاد پر ان آٹھ آپ بیتیوں کا انتخاب کیا ہے اور جن آپ بیتیوں کو تحقیق میں شامل نہیں کیا ان کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہے۔ جن آپ بیتیوں کا انتخاب تحقیق میں کیا گیا ہے وہ بھی مختلف اذہان کی عکاسی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''ہم سفر'' میں حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی اپنی یاد کے ہمراہ اختر حسین رائے پوری کی سوانح زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور ایک موقع پر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ آپ بیتی ہے یا سوانح عمری؟ اور دوسری طرف کشور ناہید اور عصمت چغتائی کی آپ بیتیوں کا انتخاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ان آپ بیتیوں میں یاد سے زیادہ فریاد کا پہلو نمایاں ہے۔ ممتاز پروین نے پہلے باب میں آپ بیتیوں کے اصول و ضوابط پر روشنی ڈالنے کے بعد تمام آپ بیتیوں کا تجزیہ ان ہی اصول و ضوابط کی روشنی میں کیا ہے۔ مقالہ نگار نے آخری باب (آپ بیتی) میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے حوالے سے بھی جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر ابواب (آپ بیتیوں) میں اس لحاظ سے کوئی تجزیہ پیش نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنے کی کوئی وجہ بیان کی ہے۔ ایم فل سطح پر یہ ایک عمدہ تحقیقی کام ہے کہ ایم فل کی سطح پر عموماً محقق ایک یا دو آپ بیتیوں کا انتخاب کرتا ہے لیکن اس مقالے میں مقالہ نگار نے آٹھ آپ بیتیوں پر تحقیق کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بڑا کام ہے۔

سمیرا رمضان نے ۲۰۰۶ء میں ایم اے اردو میں ''انتظار حسین کی خود نوشت (چراغوں کا دھواں) کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں انتظار حسین کے سوانحی خاکے، دوسرے باب میں انتظار حسین کی تصانیف کا مختصر جائزہ، تیسرے باب میں انتظار حسین کی یادداشتوں چراغوں کا دھواں کا مطالعہ پیش کیا ہے، جب کہ آخری باب میں تحقیق کے نتائج اور آپ بیتی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اپنی اس تحقیق کو خود نوشت کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چراغوں کا دھواں انتظار حسین کی خود نوشت نہیں بلکہ یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ انتظار حسین کی آپ بیتی یا خود نوشت ''جستجو کیا ہے؟'' مقالہ نگار نے خود بھی باب سوم کی پہلی سطر میں اس غلطی کا اعتراف کیا ہے کہ ''چراغوں کا دھواں انتظار حسین کی وہ دل فریب تخلیق ہے جو ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔''[۲] لیکن صفحہ نمبر ۲۴، ۳۰، ۳۴، ۴۱، ۴۶، ۷۷، ۸۳، ۹۷، ۱۰۴، ۱۳۶ میں تکرار کے ساتھ اپنی اس تحقیق میں خود نوشت کا ہی لفظ استعمال کیا ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیق میں یہ بنیادی سقم اس لیے پیدا ہوا ہے کہ اس نے آپ بیتی یا خود نوشت کے فن پر بالکل بھی روشنی نہیں ڈالی۔ اگر مقالہ نگار نے خود نوشت کے فن سے متعلق اچھی طرح آگہی حاصل کی ہوتی اور خود نوشت کے لوازمات اور محرکات کے بارہ میں جائزہ لیا ہوتا تو وہ ہر گز اپنی تحقیق کو خود نوشت نہ کہتی۔ یادداشت کو انگریزی میں Memoir کہتے ہیں جو کہ فرانسیسی لفظ Memory سے آیا ہے۔ یہ ادب کی ایک صنف ہے جہاں مصنف اپنے بچپن میں واپس جا کر اپنی یادوں کے بارے میں لکھتا ہے، بسا اوقات یادداشتیں مصنف کی زندگی کے پورے حصے کا احاطہ کرتی ہیں، لیکن زیادہ تر وہ صرف زندگی کے اہم حصوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یادداشتیں اور آپ بیتی ایک ہی چیز ہے دونوں ہی صورتوں میں مصنف اپنی زندگی کی کہانی سناتا ہے، لیکن یادداشت خود نوشت سوانح عمری کی ذیلی صنف کے زمرے میں آتی ہے۔ یاد داشت اور خود نوشت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یادداشتوں میں الگ تھلگ واقعات کا ذخیرہ پایا جاتا ہے جب کہ خود نوشت میں تمام یادیں ایک ہی کہانی میں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود نوشت سوانح عمری مصنف کی ساری زندگی کا احاطہ کرتی ہے جیسے؛ بچپن، خاندانی تاریخ، تعلیم اور پیشہ سے متعلق اہم باتوں پر سے پردہ اٹھاتی ہے، جب کہ یادداشت زندگی کے صرف ایک، خاص اور اہم یادلچسپ حصہ کا احاطہ کر سکتی ہے جو ایک خاص وقت اور جگہ پر واقعہ ہوتا

ہے۔ یادداشتیں عام طور پر قارئین کو لوگوں کی زندگیوں پر تاریخی واقعات کے اثرات کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یادداشتوں میں مصنف اپنی زندگی کے احوال بیان کرنے کے لیے مختلف اصناف نثر کا استعمال کر سکتا ہے۔ ان اصناف نثر میں خطوط، روزنامچے، رپورتاژ، انشائیے اور سفر نامے شامل ہیں۔ یادداشتوں کا مصنف ان اصناف نثر کے امتزاج سے بھی اپنی زندگی کے ایک سے زائد ادوار کے احوال کو قلم بند کر سکتا ہے۔

۲۰۰۸ء میں عصمت اللہ نے ''اردو ادب کی متنوّع شخصیت — ڈاکٹر سلیم اختر (خود نوشت اور سفر نامے کے تناظر میں)'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ مقالہ نگار عصمت اللہ نے اپنے مقالے کے تیسرے باب میں ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کو بطور آپ بتی نگار کے جائزہ لیا، لیکن اس سے پہلے آپ بتی کے فن اور اس کی روایت کو بیان کیا۔ عصمت اللہ نے آپ بتی کو ایک ایسی صنف ادب قرار دیا ہے جو کسی شخص کی داستان حیات ہوتی ہے اور اسے وہ شخص خود تحریر کرتا ہے۔ یہ شخص اپنی حیات کے تمام گوشوں کو قارئین کے لیے کھول دیتا ہے جن کو وہ اپنی ذات کے حوالے سے اہم سمجھتا ہے۔ مقالہ نگار نے آپ بتی کی مختلف صورتوں کو بھی بیان کیا ہے اور خطوط و روزنامچے کو آپ بتی کی ابتدائی شکل قرار دیا ہے۔ اردو ادب میں آپ بتی کی روایت قلم بند کرنے کے بعد عصمت اللہ نے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی آپ بتی ''نشان جگر سوختہ'' کے متعلق بتایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے آپ بتی کے پہلے باب کو ''سرِ بازار می رقصم'' سے موسوم کیا ہے اور اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے آپ بتی کے جن تقاضوں اور محرکات کو بیان کیا ہے، مقالہ نگار عصمت اللہ نے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ مقالہ نگار نے آپ بتی کا سماجی و نفسیاتی حوالے سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر صاحب کی آپ بتی کو ان کے کردار کی تحلیل نفسی قرار دیا ہے۔

زینب عثمان نے ۲۰۱۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آپ بتی بلا جواز کا فکری و فنی جائزہ لے کر ایم اے کی سطح پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ مقالہ نگار نے آپ بتی کے فن کی وضاحت مختلف محققین کی آرا کے حوالے سے کی۔ مزید آپ بتی کی مختصر تاریخ اور قیام پاکستان کے بعد لکھی جانے والی اہم آپ بیتوں کے ناموں کو آپ بتی نگاروں کے ناموں کے ہمراہ تحریر کیا۔ آپ بتی ''بلا جواز'' کے فکری جائزے میں مقالہ نگار نے فرمان فتح پوری کے دیباچہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا اور فرمان فتح پوری کے احوال زندگی کو ایک خاص تناظر میں دیکھا۔ مثلاً

فرمان فتح پوری کی وطن سے محبت، اپنی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون سے وابستگی کو ڈاکٹر صاحب کے جذبات و احساسات کی ترجمانی قرار دیا۔ مقالہ نگار کا آپ بیتی کا مطالعہ دیگر مقالہ نگاروں سے اس طور منفرد ہے کہ اس مقالے کے پڑھنے سے آپ بیتی نگار کی فکر سے قاری کی براہ راست رسائی ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جو آپ بیتی لکھتا ہے اس کی شخصیت اس ماحول میں سماجی و سیاسی صورتحال سے دوچار ہوتی ہے لیکن مقالہ نگار نے فرمان فتح پوری کے احوال زندگی کو ان کی فکر کے تناظر میں لیا ہے اور یہی خاص بات اس تحقیق کو منفرد بناتی ہے۔ زینب عثمان کے اس اقتباس کو ملاحظہ کیجیے:

> ''پھر اسی پہ موقوف نہیں اُنھوں نے فتح پور کی تہذیب و ثقافت لوگوں کے رہن سہن وغیرہ کا نقشہ اس انداز میں کھینچا ہے کہ اب سے کم و بیش ایک صدی بیشتر کا تہذیبی اور ثقافتی منظر نامہ زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔''[۷]

یا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''غیر رسمی تعلیم کا ایک سلسلہ''(چوتھا مضمون) دراصل ایک کشادہ دل اور روشن خیال سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ عصر حاضر کے فتویٰ فروشی اور عدم برداشت کے ماحول ایسے واقعات اور ایسے لوگوں سے تعارف ایک خوش گوار تجربہ بن جاتا ہے۔ بلاجواز کی دل کشی کا ایک جواز یہ بھی ہے۔''[۸]

مقالہ نگار زینب عثمان نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آپ بیتی میں ان اسفار کا بھی تذکرہ کیا ہے جو طویل ترین مضمون کی صورت میں آپ بیتی میں شامل ہیں اور یہی آپ بیتی کا سب سے بڑا سقم ہے۔ سیر و سیاحت کے حوالے سے بھی سفر ناموں کا لطف آپ بیتی میں آجاتا ہے مگر اسفار کا احوال آپ بیتی نگار کے آس پاس رہنا چاہیے اور اس کی حیات سے جڑا رہنا چاہیے، اگر اس اعتدال سے تجاوز کیا جائے تو یہ سفر نامے آپ بیتی کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ یہی غلطی ڈاکٹر صاحب سے اس آپ بیتی میں ہوئی ہے لیکن مقالہ نگار نے اس سقم کے بارہ میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ زینب عثمان نے آپ بیتی کا فنی جائزہ تین عناصر کی روشنی میں لیا اور یہ تین عناصر سچائی، شخصیت اور فن ہیں۔ سچائی کے حوالے سے مقالہ نگار زینب عثمان کا کہنا ہے کہ فرمان فتح پوری نے آپ بیتی میں صداقت کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ جو واقعات براہ راست ان کے مشاہدے میں نہیں آئے یا جن کے وقوع کے سبب وہ نہیں

جانتے تھے ان کے تذکرے میں اپنے آپ کو بطور راوی پیش نہیں کیا، بلکہ ان کا تذکرہ دوسروں کی زبانی کیا۔ آپ بیتی میں فرمان فتح پوری کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالہ نگار نے آپ بیتی کے ان اقتباسات کو نقل کیا ہے۔ جو فرمان صاحب کے روزمرہ معمولات، ان کی عملی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں، مزید براں مقالہ نگار نے فرمان فتح پوری کی خودداری اور غیرت کے حوالے سے بھی واقعات کو قلم بند کیا اور فرمان صاحب کی حق گوئی اور صداقت کے حوالے سے زینب عثمان نے ایک ایسا واقعہ قلمبند کیا ہے، جس کے چشم دید گواہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔ اس کے علاوہ مقالہ نگار نے ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی کے اسلوب کا بھی جائزہ لیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی میں اسلوب کو سادگی و سلاست کی صورت میں پایا۔ زینب عثمان نے آخر میں اس آپ بیتی کے چند عیوب پر روشنی ڈالی۔ جیسا کہ ایک جگہ مقالہ نگار رقم طراز ہے:

> ''اگرچہ اس آپ بیتی میں ڈاکٹر صاحب کے احوال زندگی تفصیل سے نظر آتے ہیں لیکن زندگی کے کچھ اہم واقعات کا ذکر اس آپ بیتی میں رہ گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی میں ان کی ''اردو ڈکشنری بورڈ'' میں خدمات کا ذکر آپ بیتی میں نہیں ملتا۔''[۹]

مزید یہ کہ ابواب بندی میں تو ایک تسلسل اور زمانی ترتیب نظر آتی ہے لیکن داخلی طور پر واقعات کے بیانیے میں یہ ترتیب برقرار نہیں رہ سکی۔ ان دو خامیوں کے تذکرے کے بعد مقالہ نگار نے ان خامیوں کی وجہ بھی قلم بند کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خرابی صحت کی بنا پر ان خامیوں کو خاطر خواہ انداز میں رفع نہیں کر سکے۔

''اردو کی دو خواتین آپ بیتی نگار (کشور ناہید، عطیہ داؤد)'' کے عنوان سے ۲۰۱۴ء میں نرگس طفیل نے ایم فل کی سطح پر مقالہ لکھا۔ مقالہ نگار نے مقالے کے پیش لفظ میں واضح کیا کہ اُس نے تحقیق میں کشور ناہید کا بطور آپ بیتی نگار تجزیہ اُن کی کتاب ''نوٹ بک'' کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے اور بُری عورت کی کتھا کو آپ بیتی کے مطالعے میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ کشور ناہید کی اس آپ بیتی پر کام محض تکرار سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ مقالہ نگار نے کامیاب آپ بیتی کے لیے تین عناصر سچائی، شخصیت اور فن کی وضاحت میں آپ بیتی کے تقاضوں کی نشان دہی کی ہے۔ ایک مقام پر وہ آپ بیتی کے فن کے تقاضے کو یوں قلم بند کیا ہے:

''آپ بیتی میں تخیل اور مبالغہ آمیزی کا کوئی دخل نہیں۔اور مبالغہ آپ بیتی کے حُسن کو تباہ کر دیتا ہے۔''[۱۰]

نرگس طفیل نے آپ بیتی کے فن کی وضاحت کے بعد آپ بیتی کی روایت کو قلم بند کیا ہے اور آپ بیتی کی ابتدائی شکل ''تزک بابری'' و ''تزک جہانگیری'' کو قرار دیا اور اس کے بعد مقالہ نگار نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین؛ میر امن (باغ و بہار)، حیدر بخش حیدری (تذکرہ گلشن ہند) اور امانت لکھنوی (اندر سبھا) کی تصانیف کے دیباچوں میں موجود حالات زندگی کو آپ بیتی کے ابتدائی نقوش کہا۔ مقالہ نگار نے اپنی تحقیق میں قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں اہم آپ بیتیوں کی فہرست دی ہے۔ نرگس طفیل کا آپ بیتی کے فن میں یہ انکشاف چونکا دینے والا ہے کہ مرد اور عورت کی آپ بیتی میں انکشاف ذات کا مرحلہ صنفی امتیاز کا شکار ہے:

''مرد کے لیے یہ سوال نہیں اُٹھایا جاتا کہ سچ لکھا ہے یا نہیں، کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد سچ کہنے کی ہمت رکھتا ہے۔ مرد اخلاقی قدروں کا اتنا پابند نہیں جتنا ہمارے ہاں عورت ہوتی ہے۔''[۱۱]

کشور ناہید کی ''نوٹ بک'' کے تجزیاتی مطالعہ میں نرگس طفیل نے واضح کیا ہے کہ کشور ناہید نے اپنے عہد میں اپنے ماحول سے جو اثر لیا وہ نوٹ بک میں نمایاں ہے۔ تاہم اس کتاب میں مصنفہ کی طرف سے واقعات کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مقالہ نگار کے نزدیک عطیہ داؤد کی آپ بیتی ''آئینے کے سامنے'' ایک ایسے سفر کی روداد ہے جس میں عطیہ داؤد نے ایک پسماندہ ماحول میں پرورش پا کر اور یتیمی کی زندگی بسر کر کے خود کو شاعرہ، ادیب اور سماجی رکن کے طور پر منوایا ہے۔ نرگس طفیل نے اپنی تحقیق میں عطیہ داؤد کی زندگی کا نفسیاتی و سماجی جائزہ لیا ہے اور عطیہ داؤد کے ''صنفی امتیاز سے سخت نفرت'' کو اس آپ بیتی کے لکھنے کا محرک قرار دیا ہے۔ مقالہ نگار نے اپنی تحقیق میں دونوں ادیبہ خواتین کی آپ بیتی کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور دونوں کی روداد کو معاشرے میں اپنی بقا کی جنگ قرار دیا ہے۔

محمد عرفان نے ایم فل کی سطح پر تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتیوں (نشانِ جگر سوختہ اور تمنا بے تاب) کا فنی و فکری مطالعہ'' کے عنوان سے ۲۰۲۰ء میں لکھا۔ مقالے کے عنوان سے

واضح ہے کہ رشید امجد کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب'' تحقیق میں شامل ہے۔ لیکن جب مقالہ نگار تحقیق کے بے کراں سمندر میں داخل ہوا تو اس کے علم میں آیا کہ رشید امجد کی آپ بیتی کا تازہ ترین ایڈیشن ''عاشقی صبر طلب'' بھی مارکیٹ میں آچکا ہے۔ اس پر نئے ایڈیشن کی تلاش کے بعد ''تمنا بے تاب'' کے ہمراہ ''عاشقی صبر طلب'' کو بھی تحقیق میں ساتھ رکھا۔ یہ امر مقالہ نگار کی تحقیق کے میدان میں راست بازی اور استقامت کو ظاہر کرتا ہے۔ محمد عرفان نے آپ بیتی کی تعریف ان الفاظ میں کی:

> ''آپ بیتی یا خود نوشت سوانح حیات کے خوشگوار اور ناخوشگوار و ہر طرح کے رویّوں اور واقعات کے اظہار کا نام ہے۔ آپ بیتی کا موضوع مصنف کی خود کی زندگی ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا اظہار ہے جس سے اس شخص کی زندگی کی مختلف پرتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور شخصی رویّے نہاں خانوں سے نکل کر چلمن کے پیچھے چھپنے کی بجائے ایک کھلی کتاب کا درجہ پا جاتے ہیں۔''[۱۲]

مقالہ نگار محمد عرفان نے آپ بیتی کے فن کی اہمیت بھی اُجاگر کی ہے اور آپ بیتی کو مصنف کی سیاسی، مجلسی، ادبی، صحافتی اور معاشرتی، اخلاقی اور نفسیاتی زندگی کے ہر پہلو کو اہم آئینہ قرار دیا ہے۔ محمد عرفان نے آپ بیتی کے فن کی وضاحت میں تین اصولوں کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ تین اصول آپ بیتی میں سچائی و صداقت کا اظہار، آپ بیتی نگار کی شخصیت کا انکشاف اور آپ بیتی کے فن کے تقاضے ہیں۔ محمد عرفان کے خیال میں اردو میں آپ بیتی نے نہ صرف انگریزی بلکہ عربی اور فارسی بانوں سے بھی ارتقا حاصل کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اردو میں جو آپ بیتیاں لکھی ہیں، اُن کی طویل فہرست سن کے اعتبار سے مقالے میں دی ہے۔ محمد عرفان نے ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' کا فنی و فکری جائزہ لیا ہے۔ تحقیق میں ایسے اقتباسات کو شامل کیا گیا ہے جن سے ڈاکٹر صاحب کی سوانح کے مختلف گوشے اُجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً مقالہ نگار رقم طراز ہے:

> ''آپ بیتی ''نشان جگر سوختہ'' کا زیادہ تر حصہ مختلف واقعات و حوادث پر مشتمل ہے جو مختلف اشخاص اور ادب شخصیات کے متعلق ہے۔ ان میں مصنف کی ہر جگہ یہ کاوش رہی ہے کہ اپنی ذات کو پنہاں نہ ہونے دیا جائے۔ اگر ایسی صورتحال بنی بھی ہے تو مصنف نے خود کو اس کا نشانہ بننے سے نہیں روکا بلکہ مزاح سے اپنی ذاتی گراوٹ کو جابجا بچالیا ہے۔ یہی مصنف

کے اسلوب کا کمال ہے کہ اس نے ہر وہ بات بے کم و کاست کہی ہے جس سے اُس کی ذات کی پرتیں کھل سکتی تھیں۔ دیکھا جائے تو یہ آپ بیتی ایک ماہر نفسیات کی علمی بصیرت اور ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''[۱۳]

مقالہ نگار محمد عرفان نے ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی کے اسلوب کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آپ بیتی نگار کی جانب سے جو انگریزی، ہندی اور فارسی زبان کے الفاظ استعمال کیا ہے ان کی بڑی محنت سے فہرست مرتّب کی ہے۔ مقالہ نگار نے اس آپ بیتی کا مطالعہ فنی و فکری حوالے کے علاوہ سماجی، نفسیاتی اور تاریخی حوالے سے بھی کیا ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیق میں جو سقم مجھے نظر آیا وہ یہ ہے کہ مقالہ نگار نے آپ بیتی کا فنی و فکری مطالعہ میں ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا۔ پہلے آپ بیتی کا فنی جائزہ لیا پھر فکری جائزہ لیا اور بعد میں پھر فنی جائزہ لیا۔ مناسب ہوتا اگر فنی جائزے کو ایک ساتھ بیان کیا جاتا اور فکری جائزے کو الگ سے بیان کیا جاتا۔

مقالہ نگار نے اپنی تحقیق کے تیسرے باب میں ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب'' کا فنی و فکری جائزہ لینے سے قبل رشید امجد کی ادبی خدمات پر طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ ''تمنا بے تاب'' اور ''عاشقی صبر طلب'' کے فنی جائزے میں مقالہ نگار نے یہ محسوس کیا ہے کہ واقعات کی روایت میں تکرار کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن اس تکرار سے مقالہ نگار کے نزدیک دلچسپی کا عنصر کم نہیں ہوتا۔ محمد عرفان نے مذکورہ آپ بیتی میں ایسے اقتباسات کو بیان کیا ہے جن سے رشید امجد کے لاشعور تک قاری کی رسائی ہوتی ہے۔ مزید براں مقالہ نگار نے رشید امجد کی خود نوشت میں متضاد رویّوں کو بھی اُجاگر کیا۔ آپ بیتی کو خود نوشت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں پرکھنے کے بعد مقالہ نگار کی رائے ہے کہ رشید امجد کی آپ بیتی میں حقائق کو نہایت دیدہ دلیری سے پیش کیا گیا ہے۔ جہاں سادگی، درویشی، خلوص نیت اور دیگر اوصاف حمیدہ مذکور ہیں، وہیں خود کو مے نوش کہنے، محبت میں ناکامی اور دیگر کیفیات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ دونوں آپ بیتوں کے تقابلی جائزے کے بعد محمد عرفان نے یہ واضح کیا ہے کہ آپ بیتی نگاروں نے نہ تو تعلّی سے کام لیا ہے اور نہ ہی اخفائے ذات کے بھنور میں خود کو گرفتار کیا ہے۔ تاہم ''نشان جگر سوختہ'' میں ''تمنا بے تاب'' کی نسبت سیاسی حالات کا تذکرہ کم ہوا ہے۔ مزید مقالہ

نگار نے بتایا کہ دونوں آپ بیتیوں میں ادبی حلقوں و بیٹھکوں کا ذکر شدّ و مد سے موجود ہے اور دونوں آپ بیتیوں میں آپ بیتی نگاروں نے معرّب و مفرّس الفاظ کے استعمال سے اسلوب کو بوجھل بنایا ہے۔

الغرض اردو آپ بیتی کا فن زیادہ قدیم نہیں اور جو آپ بیتیاں لکھی جا رہی ہیں اُن کو پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ آپ بیتیاں مخصوص روایت کے طور پر لکھی جا رہی ہیں اور ان آپ بیتوں پر صنف ادب کا احتمال نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس صنف پر ہونے والی تحقیق کی رفتار اور معیار بھی اتنا قابلِ ستائش نہیں۔ ابھی بھی اس صنف کی تحقیق میں وسیع امکانات موجود ہیں۔ اردو آپ بیتی کے محققین کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اس صنف کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ثمینہ امین، ''جو رہی سوبے خبری رہی'' ادا جعفری اور ''ہم سفر'' حمیدہ اختر کا تقابلی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۶۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۴۔ عطیہ رسول، آپ بیتی کا فن اور میرزا ادیب کی آپ بیتی ''مٹی کا دیا'' کا تجزیہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۶۔

۵۔ ممتاز پروین، اردو کی خواتین آپ بیتی نگار، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۶۵۔

۶۔ سمیرا رمضان، انتظار حسین کی خود نوشت چراغوں کا دھواں کا تجزیاتی مطالعہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۶۔

۷۔ زینب عثمان، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آپ بیتی ''بلاجواز'' کا فکری و فنی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۶۔

۸۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۹۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۱۰۔ نرگس طفیل، اردو کی خواتین آپ بیتی نگار (کشور ناہید، عطیه داؤد)، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء)، ص۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص۱۳۔

۱۲۔ محمد عرفان، ڈاکٹر سلیم اختر اور رشید امجد کی آپ بیتیوں (نشان جگر سوختہ، تمنابے تاب) کا فنی و فکری جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، (بہاول پور: دی اسلامیہ یونیورسٹی، ۲۰۲۰ء)، ص۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص۸۱۔